© rasailojaraid.com

شکریہ عرب بہار
حتمی کامیابی امریکہ کے لیے کیوں؟

محمود شیخ-علی

خلاصہ:

عرب بہار کو مشرق وسطیٰ کے مظلوم اور پسے ہوئے شہریوں کے لیے ایک نقطۂ انقلاب سمجھا گیا تھا۔ ملک پر آہنی گرفت کے ساتھ حکومت کرنے والے مطلق العنان حکمران اب پرانے طور طریقوں سے عوام پر قابو نہیں رکھ سکتے اور ان پر مظالم نہیں توڑ سکتے۔ غیر یقینی واقعات کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ اکیسویں صدی نے نئی نسل کو تقویت دے کر ایک ٹیکنالوجیکل انقلاب کی راہ ہموار کی ہے۔ ایسی نئی نسل جو مختلف آبادیوں، مذاہب اور طبقات سے ضرور تعلق رکھتی ہے لیکن تبدیلی کے لیے اٹھنے والی ہر آواز پر لبیک کہتے ہوئے متحد ہے۔ اپنی ہی حکومت کے خلاف آواز اٹھانے کا تصور مغربی دنیا میں تو معروف ہو سکتا ہے؛ لیکن یہ فن خطابت مشرق وسطیٰ میں رہنے والے کروڑوں افراد کے لیے بالکل بیگانہ ہے۔ گزشتہ اٹھارہ ماہ میں ایسا محسوس ہوا کہ کئی عرب ریاستوں کے دارالحکومت اب امریکہ کی جیب میں نہیں رہے۔ عربوں کی جانب سے جمہوری انداز میں نئے قانون سازوں اور نئے رہنماؤں کے انتخاب سے ایسا ظاہر ہوا کہ یہ مغرب کے بجائے مقامی آبادیوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اٹھتی ہوئی آواز ہے۔ لیکن کیا امریکہ کا اثر و رسوخ علاقے میں واقعی گھٹ چکا ہے یا شاہی نے جمہوری لباس پہن لیا ہے اور پرانے محافظ نئی وردی میں اپنی جگہ بدستور موجود ہیں؟ ذیل میں سعودی عرب، شام و مصر کے حوالے سے امریکہ کی اس خارجہ پالیسی پر بحث ہوگی کہ عرب بہار کی وجہ سے بدلتے ہوئے منظرنامے کے باوجود امریکہ کے قومی مفادات کو کیسے یقینی بنایا گیا ہے۔ [واضح رہے کہ یہ تحریر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صدر مرسی کا تخت الٹے جانے سے قبل کی ہے۔]

تعارف

شام میں معیشت لب گور ہے اور ریاست ایک غیر یقینی مستقبل کی جانب رواں دکھائی دے رہی ہے۔ سعودی عرب اور دیگر پڑوسی خلیجی ریاستوں نے امریکی بحریہ کے جہازوں اور فوجی اہلکاروں کی بڑی تعداد کو خطے میں اجتماع کی اجازت دے رکھی ہے۔ مصر میں مقتدر حلقوں نے قومی انتخابات کے نتائج کو مسترد کر دیا۔ یہ جولان کی پہاڑیوں میں شکست کے بعد، جنگ خلیج اور کویت میں عراقی جارحیت کے بعد کے سعودی عرب، یا اسرائیل کے ساتھ امن معاہدے پر دستخط کے بعد والی مصر کی صورتحال جیسا ہے، جبکہ درحقیقت یہ آج کا مشرق وسطیٰ ہے۔ بہت سے لوگ جسے عرب عوام کی منزل مقصود سمجھ رہے تھے، ڈیڑھ سال بعد محض ایک وقتی جنون میں تبدیل ہو چکا ہے۔ شامی حزب اختلاف اور سرکاری قوتیں بددل ہیں اور جان جوکھوں کی حالت میں ہیں۔ مصر نے طویل عرصے تک حکمران رہنے والے فرعون حسنی مبارک کی کرسی کو ایک کٹھ پتلی نشست بنا دیا اور عسکری کونسل کو ملک کا حاکم اعلیٰ بنا دیا اور مشرق وسطیٰ کے خلیجی ممالک امریکی دفاعی اداروں کے ذریعے اپنی افواج اور اسلحہ خانوں کا پیٹ بھر رہے ہیں، وہ بھی اتنی تیزی سے کہ جتنی جلدی ان کا تیل سے لبریز بیرل بھر پائے۔ روس نے اپنے چند اتحادیوں کو گنواتے ہوئے دیکھا اور باقی مصنوعی سانسوں پر چل رہے ہیں جبکہ باقی دیگر حکومتوں کو اس نے اپنا دشمن بنا لیا۔ ایران اپنے احیائے شیعیت کی امیدوں کو کم ہوتا دیکھ کر بدستور کونے میں دبکا ہوا ہے۔ عرب بہار نہ حزب اختلاف کو متحد کر پائی اور نہ ہی کوئی ایسی توانا آواز تخلیق کر سکی جو ٹوٹ پھوٹ کے شکار اس خطے کو یکجا کر سکے۔ تیونس میں ہم نے دیکھا کہ نچلے طبقے کے پسے ہوئے لوگ سڑکوں پر نکلے، جبکہ مصر میں ٹیکنالوجی کے شیدائی شہری نوجوان گھر سے نکلے۔ لیبیا میں حزب اختلاف کی تمام تر قوت مشرقی قبائل کی نچلے درجے کے افراد پر مشتمل ہے جبکہ شام نے عراق کے انتہا پسند اور بنیاد پرست اسلامیوں کے لیے دروازے کھولے۔ عرب بہار کے نتیجے میں مشرق وسطیٰ شاید تبدیل ہوا ہو، لیکن خطہ اب امریکی مفادات کی طرف زیادہ جھکا ہوا نظر آتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سعودی عرب اور مشرق وسطیٰ کے دیگر خلیجی ممالک

دنیا بھر میں تیل کے سب سے بڑے صارف اور سب سے زیادہ تیل پیدا کرنے والے ملکوں کے درمیان تعلق کا اندازہ کوئی کیسے لگائے گا؟ کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ایک غیر سیکولر بادشاہت اور سیکولر جمہوریت کے درمیان باہمی اعتماد کی بنیاد دونوں کے باہمی مفادات کے بہتر فہم پر کھڑی ہے۔ دیگر کا کہنا ہوگا کہ ایک ریاست دوسری ریاست کے وسائل کا استحصال کر رہی ہے۔ لیکن کون کس کا استحصال کر رہا ہے، ایک جانب توانائی سے لگاؤ رکھنے والا ۳۰۰ ملین آبادی کا ملک ہے اور دوسری طرف (اگر عورتوں کی آبادی کو شامل کریں تو) تقریباً ۲۵ فیصد بے روزگار لوگوں اور ۱۵ سال کی درمیانی عمر رکھنے والا ملک۔ سعودی عرب خطے میں تیل کے ذخائر کی حامل ریاستوں (کویت، متحدہ عرب امارات، بحرین، قطر اور عمان) پر مشتمل خلیج تعاون کونسل (جی سی سی) کی قیادت کرتا ہے۔ یہ ریاستیں، خصوصاً سعودی عرب، اپنی سکیورٹی کو یقینی بنانے کے لیے اپنے شہریوں کی سماجی حالت کی بہتری کو ہمیشہ اہمیت دیتی ہیں۔ اس امر کو ذہن نشین رکھتے ہوئے، سعودی عرب کی جانب سے امریکہ کو استحقاق بخشنے کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ صدر جمی کارٹر نے موثر نظریے کی گردان کی اور اعلان کیا تھا کہ مشرق وسطیٰ میں مداخلت کی کوشش کرنے والی کسی بھی بیرونی قوت کو امریکہ کے لیے خطرہ سمجھا جائے گا اور اس کے خلاف عسکری قوت کا استعمال ہوگا۔ یہ عراق [۲۰۰۳ء] میں امریکی افواج کی آمد، جنگ خلیج [۹۰ء کی دہائی کے اوائل] اور لبنان [۸۰ء کی دہائی کے ابتدائی ایام] میں فوجیوں کی آمد سے کہیں پہلے کی بات ہے، جو کارٹر کے بیان کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے۔ صدر کارٹر نے امریکہ کے کردار کو سمجھا اور خطے کے لیے ایسی وابستگی ظاہر کی جو قومی مفاد میں عرصہ دراز تک نتائج پیش کرے گی۔

امریکہ اور سعودی عرب کی رفاقت کی تاریخ فرینکلن ڈی روز ویلٹ کے عہد صدارت سے جا ملتی ہے۔ دونوں ریاستوں کے گہرے تعلقات کو، رازدارانہ کیفیت کی وجہ سے، بسا اوقات باقی دنیا غلط انداز میں سمجھتی ہے۔ اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ تعلقات امریکی عسکری و اقتصادی بالادستی کے نتیجے میں یک طرفہ بالادستی کی کیفیت میں ہیں۔ نائن الیون کے بعد سعودی عرب اور امریکہ کے درمیان طویل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گرم جوش تعلقات ٹھنڈے پڑنا شروع ہوئے لیکن امریکہ اب بھی سعودی تیل کا سب سے بڑا خریدار ہے اور اسے مسلسل جدید فوجی ٹیکنالوجی فراہم کر رہا ہے، (بروکس، ۲۰۰۵ء)۔ اس کے بدلے میں امریکہ عالمی مارکیٹ کے مقابلے میں سستے تیل کا فائدہ سمیٹتا ہے اور ساتھ ساتھ خطے میں تزویراتی اہمیت کے حامل ایک ملک کا اتحادی ہے جو مشرق وسطیٰ میں دیگر ریاستوں پر اپنی خارجہ پالیسی لاگو کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔

مملکت سعودی عرب کے اکثر شہری افراط زر، بے روزگاری اور غربت کو اپنے مستقبل کو لاحق براہ راست مسائل سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے سعودی امریکہ کی خارجہ پالیسی سے آگے دیکھتے ہیں اور اہم تزویراتی معاشی سپر طاقت کی حیثیت سے امریکہ کے ساتھ شراکت داری کو اہمیت دیتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام تک عرب دنیا مغرب کو سامراج سمجھتی تھی، (سلہی ۲۰۰۴ء)۔ جب امریکہ کے ساتھ دوطرفہ مذاکرات ہوئے تو سعودی عرب نے ان تعلقات کو خطرے کی حیثیت سے نہ دیکھا۔ اس نے عرب بہار کے آغاز کے بعد آنے والے عرصے میں اہم کردار ادا کیا۔ تیونس، مصر اور لیبیا میں لوگ اپنی معاشی حالت اور عوام میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے سڑکوں پر آئے۔ اس کے مقابل میں سعودی عرب کے مشرقی صوبے میں مختصر عرصے کے لیے سڑکوں پر آنے والے افراد سنی شیعہ تفریق کی وجہ سے آئے۔ ایک ایسا ملک جہاں سنی مسلمانوں کی اکثریت ہو، عوام کی اکثریت شیعہ مسلمانوں سے ہمدردی نہیں رکھتی، اس لیے مظاہرین کو کوئی مدد حاصل نہ ہوئی اور اپنے اجتماع کو برقرار رکھنے میں وہ ناکام رہے۔ بے روزگاری کی زبردست شرح کے باوجود بیشتر سعودی سمجھتے ہیں کہ وہ مفت صحت کی سہولیات، تعلیم، محصولات سے آزادی اور مفاد عامہ کی سہولیات پر تقریباً نہ ہونے کے برابر اخراجات کی وجہ سے آرام دہ طرزِ زندگی گزار رہے ہیں۔

سعودی عرب نے اپنی قومی شناخت کی رگِ حیات یعنی توانائی کی کمان ایک سپر طاقت کے حوالے کر کے اپنی حاکمیت پر بڑی قربانی دی ہے۔ لیکن دوسری جانب عالمی سپر طاقت کو اپنا نمبر ایک صارف بنانے کے علاوہ تیل کے امریکی اداروں نے سعودی عرب کو ایسی ٹیکنالوجی سے ہمکنار کر دیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے جس کا کوئی ثانی نہیں اور نتیجہ ''دنیا کے تقریباً ایک چوتھائی تیل کے ذخائر پر کم ترین پیداواری اخراجات'' کی صورت میں نکلا ہے (لانگ، ۲۰۰۴ء)۔ امریکہ نے سعودی عرب کو ابتداء ہی سے مدد فراہم کر کے تیل کے اخراج اور پیداوار میں خود انحصار بنا دیا ہے تاکہ وہ عوام کی بہتر انداز میں خدمت کر سکے۔ شیورون اور ایکسون جیسے آج کے امریکی اداروں نے (جو اس وقت ایسو اور موبل تھے) مملکت کے منافع اور اس کے عوام کو دولت کا ایندھن فراہم کیا۔ دونوں ریاستوں کی دوگانگی کے باوجود امریکی حکومت کے عہدیداران نے اپنے سعودی ہم منصبوں کو قائل کر رکھا ہے کہ وہ امریکہ کی سعودی عرب کے قدرتی وسائل میں گہری وابستگی کی جانب اپنے عوام کی توجہ کیسے مبذول کروائیں۔ مملکت سعودی عرب کے ساتھ امریکی تعلقات تیل کی صنعت سے کہیں آگے تک پھیلے ہوئے ہیں کیونکہ امریکہ اقتصادی ترقی میں بھی کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔ سعودی عرب اپنے عوام کو خوش رکھنے کے قابل ہے کیونکہ اپنی معیشت سے حاصل ہونے والی آمدنی سعودی عوام میں از سر نو تقسیم ہوئی بشمول ''مظلوم'' طبقے کے۔ ریاست کی حدود میں رہنے والے تمام افراد کو یکساں قومی خصوصیات کا حامل قرار دے کر ایک طرح کے اتحاد کی بنیاد رکھی گئی جس کا انحصار حکمران پر نہیں بلکہ برادری کی فطرت پر ہو (گل، ۲۰۰۳ء) آج سعودی عرب کا قومی تیل ادارہ سعودی ارامکو خطے کی کسی بھی دوسری قومی تیل کمپنی کے مقابلے میں زیادہ مقامی آبادی کا حامل ہے۔

''نو آبادیاتی قبضے سے توجہ ہٹا کر عسکری و اقتصادی قوت پر زور دے کر استعماریت کی تشکیل نو کی گئی''، (بلیک، ۲۰۰۸ء)۔ اور اس کے لیے سعودی بادشاہت نے تزویراتی شراکت دار کی حیثیت سے یورپ کے بجائے امریکہ کا رخ کیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ امریکی کبھی اس جگہ کو اپنا بنانے کا دعویٰ نہیں کرے گا۔ سعودی ریاست نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ ''عالمی مارکیٹ میں مقابلے کے لیے منصوبہ بندی کے تحت اور تحفظ پذیر ریاستی مداخلت کی ضرورت ہے''، (برکے، ۱۹۹۱ء)۔ باوجودیکہ ایک ریاست مداخلت کو حملے کی زد میں ہونے کی حالت اور استحصال کے لیے موقع سمجھے، امریکہ نے عالمی مارکیٹ میں داخلے کی سعودی دلچسپی کو قبول کیا۔ واشنگٹن کو معلوم تھا کہ سماجی پالیسی اور انسانی حقوق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جنیوا کے دیکھنے کا معاملہ ہے جبکہ سرمایہ کاری اور اقتصادی ترقی امریکہ کا میدان ہے۔ اس کے لیے امریکہ نے لابی اور رہنمائی کر کے سعودی عرب کو ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کا رکن بنوایا۔ اور اس وقت سے امریکہ نے تزویراتی طور پر ایسے بیج بو دیے، جنھوں نے یقینی بنایا کہ امریکہ۔سعودی دوستی کسی بھی بیرونی خطرے، داخلی انقلاب، یا جدید اصطلاح میں عرب بہار، پر قابو پا سکتی ہے۔ ''ریاست معیشت میں شامل ہو چکی ہے اگرچہ اس شمولیت کے درجوں میں تفاوت ہے، جس میں محض ایجنٹ کے تقرر سے لے کر بنیادی ڈھانچے کی تعمیر یا مارکیٹ میں متحرک حریف ادارے تک کے تمام مراحل شامل ہیں۔'' (برکے، ۱۹۹۱ء)

سعودی عرب اور پورے مشرق وسطیٰ کو درپیش سب سے بڑا خطرہ مضطرب نوجوان آبادی ہے۔ ۱۵ سے ۲۹ سال کے درمیان کی ۳۰ فیصد آبادی (اسعد، ۲۰۱۰ء) اور ۳۰ سال سے کم عمر کُل ۵۹ فیصد افراد عرب بہار کے پس منظر کی متحرک قوت تھے۔ ''دنیا کی دس بہترین جامعات میں سے آٹھ'' (زکریا، ۲۰۰۷ء) کا حامل امریکہ ایک مرتبہ پھر مسیحا بن سکتا تھا، جو سعودی نوجوانوں کو راستہ دکھائے۔ سعودی نوجوانوں کی محض ۸۰ فیصد آبادی کے خواندہ ہونے کے ساتھ ریاست کے بنیادی ڈھانچے کی ترقی کا تعلق خواندگی میں اضافے سے ہے۔ ''صنعت کاری کے ساتھ ساتھ بطور سماجی انقلاب بالغان کی خواندگی میں زبردست پیشرفت ہوئی''، (گل، ۲۰۰۳ء)۔ سعودی عرب جی ۲۰ ممالک میں تیسرا سب سے کم شرح خواندگی رکھنے والا ملک ہے، اور جنوبی افریقہ اور بھارت سے محض تھوڑا سا ہی آگے ہے۔ سعودی عرب کے گریجویٹ طلبہ میں سے دو تہائی اسلامی تعلیم کی سند رکھتے ہیں۔ مملکت میں تیل کی دریافت کو مکمل کرنے کے لیے امریکہ نے اپنے مالیاتی ذخائر برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ سعودی نوجوانوں کو اکٹھا کرنے کی نئی حکمت عملی ترتیب دی۔ تجارتی خسارے کی مکمل تلافی کے بغیر تیل کی کثیر برآمدات کی ادائیگی کے لیے امریکہ نے ہزاروں سعودی طلبہ کو امریکی جامعات میں داخلوں کے لیے مدعو کیا، اس تیل کی قیمت کے بدلے میں جو سعودی مارکیٹ سے خریدا گیا۔ کیونکہ تیل ڈالر کے ساتھ منسلک ہے، اس لیے سعودیوں نے جانا کہ یہ اقدام امریکی گاڑیوں میں تیل کے بہاؤ کو برقرار رکھنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ساتھ اپنے نوجوانوں کو سائنس و انجینئرنگ میں اہم مواقع فراہم کرنے میں مدد دے گا۔ خرچ کرنے میں فیاض سعودی طلبہ پر مغربی زندگی کی عیش پسندی آشکار ہوئی۔ گو کہ یہ خوف ضرور تھا کہ ممکنہ طور پر یہ سعودی طلبہ اپنے وطن واپس جا کر مسلم دنیا میں مغرب کے گناہوں کا پردہ فاش کریں، لیکن یہ خطرہ اس کیفیت تک نہ پہنچا کہ ثمر آور ہو کیونکہ ان طلبہ کو اپنی تعلیم کی وجہ سے مملکت میں فوری طور پر اعلیٰ سطحی اور اہم عہدے مل گئے۔ نائن الیون کے فوراً بعد امریکی امیگریشن قوانین نے ترقی پذیر دنیا کے نوجوان طلبہ کے لیے تعلیم کی خاطر امریکہ آنا تقریباً ناممکن بنا دیا۔ لیکن جب قانون سازوں کو اندازہ ہوا کہ سعودی اور قطری طلبہ امریکی کام کے حصول کے لیے امریکہ نہیں آرہے، تو خلیج میں امریکی قونصل خانے ہزاروں کی تعداد میں تعلیمی ویزے بانٹنے لگے۔ آج امریکہ میں تقریباً ۳۰ ہزار سعودی طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

سعودی طلبہ کو نصابی کتب سے مسلح کرنے کے علاوہ امریکہ نے خطرناک علاقے میں برتری حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ شاہی خاندان کو بھی، سوائے جوہری میزائلوں کے، تمام جدید ترین اسلحے سے لیس کر دیا ہے۔ لیکن حال سے پہلے کبھی سعودی حکومت نے عسکری اخراجات کے لیے اپنے خزانوں کے منہ نہیں کھولے۔ کیونکہ امریکہ کی اپنی عسکری طاقت میں مسلسل سرمایہ کاری، ٹیکنالوجی میں جدید ترقی اور خطے میں موجودگی نے سعودی عرب کو امریکہ کے ساتھ تعلقات پر تشویش میں مبتلا کر رکھا تھا۔ سعودی عرب کے لیے ''امریکہ کے روایتی و جوہری ہتھیاروں نے نہ صرف دفاعی اخراجات کو کم کیا تھا بلکہ بہترین حفاظت بھی فراہم کی'' (مرڈن، ۲۰۰۲ء)۔ امریکی عسکری اخراجات اپنے قریب ترین تمام ملٹری بجٹوں سے بھی زیادہ ہیں اور ''دنیا کے کل عسکری اخراجات کا ۴۰ فیصد'' ہیں (بلیک، ۲۰۰۸ء) بلاشبہ امریکہ کی جوہری ترقی سوویت یونین اور سرد جنگ کا نتیجہ تھی اور یہی وہ مقام ہے جہاں امریکہ اور سعودی عرب کے مفادات محض تیل کے حصول سے آگے بڑھے۔ سعودی عرب سوویت یونین کے حوالے سے ویسی ہی تشویش کا شکار تھا جو امریکہ کو درپیش تھی۔ ''امریکہ کے لیے تیل کے بہاؤ کو برقرار رکھنا اور اشتراکیت کے پھیلاؤ کو روکنا پالیسی کا مرکزی حصہ تھا، اور مختصر آبادی کے حامل لیکن سب سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیادہ تیل پیدا کرنے والے ملک سعودی عرب نے سوویت اور دیگر بنیاد پرست ریاستوں کے بیرونی خطرے کے مقابلے میں حفاظتی چھتری فراہم کرنے کے لیے امریکہ کی جانب دیکھا (لانگ، ۲۰۰۴ء)۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اور سرد جنگ کے ابتدائی مراحل میں امریکہ نے سعودی دفاعی افواج کو انہی کی سرزمین پر تربیت فراہم کرنے اور مسلح کرنے کے معاہدے پر دستخط کیے۔ بس اسی وقت سے سعودی صرف یہ جانتے ہیں کہ واحد ذریعے کی حیثیت سے امریکی ہتھیاروں کو کیسے استعمال کرنا ہے۔ البتہ سعودی مملکت میں امریکی فوجیوں کی اتنی بڑی تعداد میں موجودگی کی اجازت دے کر ملنے والا اطمینان نائن الیون کے بعد کم ہونا شروع ہوا۔

آج ایک مرتبہ پھر سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات جیسے مشرق وسطیٰ کے خلیجی رہنماؤں کی بدولت امریکہ خلیج فارس میں ایف-۲۲ اور ایف-۱۵ اسی جیسے جنگی طیاروں پر مشتمل دو علاحدہ اڈوں کا اضافہ کر چکا ہے۔ مزید برآں، امریکی بحریہ نے آبنائے ہرمز میں جہازوں اور بارودی سرنگیں صاف کرنے والے جہازوں کی تعداد کو دوگنا کر لیا۔ عراق سے امریکی دستوں کے اخراج کا مطلب ہرگز خطے میں ان کی موجودگی میں کمی نہیں لیا جانا چاہیے۔ خطے کے کئی عرب اس گمان کے ساتھ سکون کا سانس لیتے پائے گئے کہ امریکہ کے قدم مشرق وسطیٰ سے مشرق بعید منتقل ہو رہے ہیں۔ گو کہ اس میں حقیقت ضرور تھی لیکن یہ سکون کا سانس بہت مختصر رہا۔ بحرین میں پیدا ہونے والے اضطراب اور شام میں ہنگاموں نے شاہی خاندان کی راتوں کی نیندیں حرام کر دیں جنہیں اپنے ہی گھر میں شیعیت کے احیاء کے ڈراؤنے خواب نظر آ رہے تھے۔ ان واقعات نے خلیج کی سنی آبادیوں میں زبردست ہلچل پیدا کی اور شام، یمن اور ہر مقام پر مغرب کی جانب سے عسکری مداخلت کے مطالبے اٹھنے لگے۔ یہ سب کچھ خلیجی رہنماؤں کی جانب سے واشنگٹن سے وفاداری اور فرمانبرداری کے وعدوں کو یقینی بنا رہا ہے۔

مشرق وسطیٰ کے خلیجی ممالک کے لیے سب سے بڑا خطرہ ایران ہے۔ کئی حلقوں کا خیال ہے کہ ایرانی حکومت کے حوالے سے امریکی-سعودی خارجہ پالیسی درحقیقت اسرائیل کے مفاد میں ہے۔ یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درست بھی ہوسکتا ہے لیکن خمینی حکومت کو تنہا کرنے سے فائدہ اٹھانے والا اسرائیل واحد ملک نہیں ہے۔''ایک تہائی سعودی عوام ایران کے جوہری پروگرام کے خلاف امریکہ کے عسکری حملوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور ایک چوتھائی کا کہنا ہے کہ وہ اسرائیل کی جانب سے ایسے آپریشن کی حمایت کریں گے۔'' پولاک، صفحہ ۲۰۰۹ء)۔ آیت اللہ خمینی نے خلیج میں عدم استحکام پیدا کرنے کے لیے بغاوتوں کی حوصلہ افزائی کرنے پر براہ راست سعودی حکمرانوں کو دھمکی دی تھی۔ مملکت نے ایرانی دھمکی کو پہلے ہی سمجھ لیا کیونکہ وہ اپنے قریبی چھوٹے سے پڑوسی بحرین سے شیعیت کو احیاء کرتا دیکھ رہا تھا۔ نتیجہ یہ کہ سعودی عرب اپنے سپر طاقت دوست کی جانب ایک مرتبہ پھر پلٹا جیسا کہ وہ صدام حسین کی کویت میں مداخلت پر آیا تھا، تاکہ وہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا ووٹ استعمال کرے اور دیگر ریاستوں پر دباؤ ڈالے کہ وہ ایرانی حکومت پر پابندیاں عائد کریں۔

یہ بات نظر انداز کرنا بہت مشکل ہے کہ عرب بہار نے عالمی معاشی بحران کے وسط میں جنم لیا۔ (تیونس میں پھل بیچنے والے شخص کے حوالے سے ابہام پیدا کیے بغیر) اس ایندھن کو آگ دیتے ہوئے مشرق وسطیٰ کی حکومتیں علاقائی معیشت کو تباہ ہونے سے روکنے کی کوشش کر رہی تھیں جیسا کہ دبئی میں ہوا۔ مشرق وسطیٰ کا سب سے بڑا اتحادی، یورپی یونین تباہ کن معاشی صورتحال سے گزر رہا تھا، جس نے علاقائی حکومت کے لیے کوئی چارہ نہ چھوڑا کہ وہ اپنی معیشت کو برقرار رکھنے کے لیے امریکہ کی جانب دیکھیں۔ یہ نہیں کہا جارہا کہ امریکہ اپنے ذاتی معاشی مسائل سے محفوظ تھا البتہ یورپ کے مقابلے میں اس کی حالت خاصی بہتر تھی۔ یونان اور اسپین میں میدان تحریر جیسے مناظر نظر آتے تھے جبکہ عرب بہار کے مظاہرین ملازمتوں، بہتر تنخواہ اور بہتر طرز زندگی کے مطالبے کر رہے تھے۔ اس صورتحال میں خلیجی رہنماؤں کے لیے رہنمائی و مشاورت کی غرض سے امریکہ کی جانب دیکھنا زیادہ پرکشش تھا۔

اقتصادی پریشانیوں کا خاتمہ ریاست کی خارجہ پالیسی میں یکے بعد دیگرے آنے والی لہروں کے اثرات کی طرح تھا۔ برطانیہ نے اپنی وزارت خارجہ کے بجٹ کو کم کرتے ہوئے بیرون ملک اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تقریباً ایک چوتھائی سفارت خانے بند کر دیے اور یورپ بھر میں عسکری رہنماؤں نے اپنے عالمی اثرات میں واضح تخفیف کی۔ عام حالات میں یہ معلومات ایک حکومت کے لیے محض ایک مرحلہ ہوتی ہیں لیکن جب آپ کا سب سے بڑا دشمن ایران آپ کے داخلی سماجی معاملات میں مداخلت کرے، تو خلیج کے رہنماؤں کو ایسی یقین دہانی کی ضرورت تھی جسے سنگین حالات کی صورت میں امریکہ کی عسکری پشت پناہی کا درجہ حاصل ہو۔ امریکہ ایک مرتبہ پھر حقیقی عالمی حکمران بن چکا ہے۔

سابق وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے عراق و افغانستان میں یورپ کی مداخلت کے بارے میں ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ ''ہم براعظم میں یورپ کے غیر مسلح ہونے کا عمل دیکھ رہے ہیں جو عین جنگ کے وقت میں اپنے عسکری اخراجات کم کر رہا ہے۔'' یورپ کی جانب سے اپنی طاقت تفویض کرنے کے بدلے میں امریکہ ان کی طاقت کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے۔ امریکہ نے قائدانہ کردار اس لیے نہیں اختیار کیا کہ وہ دیگر طاقتوں پر غالب آنے کی صلاحیت رکھتا ہے، بلکہ امریکہ اور بحرالکاہل کے علاقوں میں علاقائی بالادستی کے علاوہ یہی وہ واحد ریاست ہے جو دنیا بھر میں علاقائی صورتحال میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہے۔ (بلیک، ۲۰۰۸ء)

گو کہ وہ دن گزرے کافی عرصہ بیت گیا جب صدر فرینکلن ڈی روزویلٹ ۱۹۴۵ء میں نہر سوئز میں ایک جہاز پر شاہ عبدالعزیز ابن سعود کے ساتھ تشریف فرما تھے، لیکن امریکہ نے مشرق وسطیٰ کے خلیجی ممالک کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے کافی اقدامات اٹھائے ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں امریکی وزیر خارجہ کونڈولیزا رائس نے کہا تھا کہ ''۶۰ سالوں سے امریکہ مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کی قیمت پر استحکام کو مدنظر رکھتا رہا — اور ہم دونوں حاصل نہ کر پائے۔'' ڈیوڈ لونگ نے سعودی-امریکی تعلقات کو بیان کرتے ہوئے بہترین جملہ ادا کیا کہ ''یہ تعلق ایک شادی کی طرح ہے جس میں طلاق کا کوئی امکان نہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ شادی یونہی پر آشوب رہے گی یا وقت کے ساتھ ایک مرتبہ پھر پرسکون ہو جائے گی۔'' (لونگ، ۲۰۰۴ء)

مشرق وسطیٰ سے ابھرتے ہوئے واقعات کے ساتھ کہ جہاں ایران زیادہ معاندانہ اور جارحانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رویہ اپنائے ہوئے ہے، اور یورپ اپنی الجھن کو سلجھانے میں مصروف ہے، امریکہ خلیج تعاون کونسل کی حکومتوں کے لیے استحکام کا واحد سہارا ہے۔

شام کا کانٹا

ایک مرتبہ وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے کہا تھا کہ ''مصر کے بغیر آپ مشرق وسطیٰ میں جنگ نہیں کر سکتے اور شام کے بغیر یہاں امن قائم نہیں کر سکتے۔'' شام مختلف فرقوں، اتحادوں اور شناختوں کا نمائندہ ہے، جو ریاست کے منظرنامے کو مزید پیچیدہ بناتے ہیں بلکہ پہلے سے ہی ناپائیداری کے شکار خطے میں مزید عدم استحکام پیدا کرتا ہے۔ ترکی کے لیے کرد آبادی کے حوالے سے شام ایک کلیدی سکیورٹی مسئلہ ہے۔ ایران کے لیے شام عرب دنیا میں اہم اتحادی ہے۔ سعودی عرب اور دیگر خلیجی ریاستوں کے لیے شام شیعہ ایران اور اسرائیل کے درمیان ایک درمیانی میدان ہے۔ شام سیاسی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مذکورہ بالا تمام ریاستیں امریکہ کی اہم اتحادی ہیں یا قومی تحفظ کے لیے خطرہ بنتی ہوئی سخت دشمن۔ شام صدام حسین کے عراق یا موجودہ ایران کی طرح کبھی فوری خطرہ نہیں رہا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی سے کسی حد تک سوویت یونین کے زوال میں حصہ لینے کے ساتھ شام کبھی دہشت گردی کی سرگرمیوں میں براہ راست ملوث نہیں رہا البتہ مختلف دہشت گرد عناصر کی حمایت و میزبانی کرتا رہا ہے۔

مشرق وسطیٰ میں قومی مفاد برقرار رکھنے کے لیے شام کے حوالے سے امریکہ کی خارجہ پالیسی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ شامی حکومت کو تنہا کیا جائے۔ بشار الاسد کے والد سابق صدر حافظ الاسد کے زمانے سے، جنھوں نے پایا کہ ان کی حکومت کا اثر گھٹ رہا ہے کیونکہ امریکہ نے ۱۹۷۹ء کے مصر-اسرائیل امن معاہدے میں ثالث کا کردار ادا کیا تھا۔ اسد حکومت نے فوری طور پر بھانپ لیا کہ امریکہ کی کوشش ہے کہ عرب-اسرائیل امن عمل کو شام کے بغیر محفوظ بنانا ہے اور اس لیے امن عمل کی ہر راہ میں رکاوٹ کھڑی کرنا شامی حکومت کی اولین ترجیح بن گئی۔ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائی میں شام کی حیثیت باقی دنیا سے کٹے ہوئے صحرانشینوں کے ملک سے زیادہ نہ تھی۔ امریکہ مغربی مفادات کی راہ میں رکاوٹ بننے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والے کسی بھی قسم کے عسکری استحکام یا اقتصادی اثر کو زیر کرنے کے قابل تھا۔ جولان کی پہاڑیاں شامی مداخلت کے کسی فوری خطرے سے دوچار نہ تھیں، مغربی یورپ نے خطے میں متحدہ عرب امارات اور قطر کی صورت میں نئی اقتصادی قوتوں کی راہ ہموار کی، اور امریکہ قومی خطروں سے نمٹنے اور سعودی عرب جیسے کلیدی شراکت دار سے نسبتاً کم نرخوں پر تیل کی بحالی برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔

تاہم خطے میں شام کے کردار نے نئی کروٹ تب لی جب حافظ الاسد چل بسے اور ان کے مغرب میں تعلیم یافتہ ماہر امراض چشم صاحبزادے بشار الاسد نے تخت سنبھالا۔ بشار اپنے والد کی وفات کے بعد حاکم بننے کے خواہشمند نہ تھے لیکن تنومند بھائی باسل اسد کی روڈ حادثے میں ہلاکت کے بعد بشار کو گھر واپس بلایا گیا اور ان کی تاج پوشی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔

بشار الاسد کی جانب سے اختیارات سنبھالنے کے باوجود شام ترقی کی راہ پر سستی سے گامزن تھا۔ لیکن پھر اتحادی افواج کی جانب سے عراق میں مداخلت کی گئی جس نے صدام کا تختہ الٹ دیا۔ گو کہ حافظ الاسد ۱۹۹۱ء میں عراق پر ہونے والی مداخلت کی حمایت میں اتحادی بن کر کود ے تھے، لیکن بشار نے جارج ڈبلیو بش انتظامیہ کے منصوبے کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ شام ایک مرتبہ پھر مرکز نگاہ بن گیا اور اب خطے میں ایک اہم قوت ہے کیونکہ وہ عراق کے ساتھ ۴۰۰ میل طویل سرحد رکھتا ہے۔ یہ سرحد اسلامی دہشت گردوں کے لیے داخلے کا مقام ہے جو عراق میں امریکی کارگزاریوں میں رکاوٹ ڈالنا چاہتے ہیں۔

بشار الاسد ان الزامات کی تردید کرتے ہیں لیکن عراق سے شام آنے والی تیل کی اہم پائپ لائن کی امریکیوں کے ہاتھوں تباہی اور ریاست پر مزید اقتصادی پابندیوں کو لگتے ہوئے دیکھتے ہی رہ گئے۔ بشار الاسد کے صدر بننے سے پہلے ان کے والد نے انہیں شام کی کامیاب قیادت کے چند اہم گر بتائے تھے: تاثر حقیقت کو مات دے دیتا ہے، اپنے لوگوں کے ساتھ اور باقی دنیا کے ساتھ۔

بشار نے اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے نہ صرف دہشت گرد تنظیموں پر نظر ڈالی بلکہ انہیں حکومت کی خارجہ حتیٰ کہ مقامی پالیسی میں بھی شامل کیا۔ لبنان میں حزب اللہ کو معاملہ فہم قوت کی حیثیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے طاقت دینے والی ۲۰۰۶ء کی جنگ نے شام کے جواز کو دوبارہ مضبوط کیا۔ اسرائیل کے خلاف جنگ بندی کے اعلان پر بش انتظامیہ خوش تھی لیکن امریکہ کا عدم اعتماد پروان چڑھ چکا تھا اور اسد کی جانب سے حزب اللہ کی طویل المیعاد حمایت ثمرآور ثابت ہوئی کیونکہ دمشق کی سڑکوں پر انہیں بڑے پیمانے پر قبول کیا گیا۔ اگر اسرائیل کو شامی خون سے نہیں ہرایا جاسکتا تو کیوں نہ اس جنگ کو اس گروہ کے حوالے کردیا جائے جو خود قربانیاں دینے کے لیے تیار ہے۔ اور اسی لیے اسد نے امریکہ پر اپنا اثر برقرار رکھنے کے لیے دہشت گردی کا استعمال کیا، جبکہ شام کے عوام کو یہ دلاسہ دیا گیا کہ یہ اسرائیل کو شکست دینے کے لیے ضروری ہے۔ ''جنگ کے بعد شام میں حزب اللہ کی مقبولیت کی وجہ سے شامی عوام صدر کے دلائل کے حامی دکھائی دیے۔ (لینڈس، پیس، ۲۰۰۶ء)

''آج حکومت نے ان عناصر کو بحیثیت جواز تسلیم کرلیا اور یوں اپنی آزادی پر سودے بازی کی'' (حداد، ۲۰۰۵ء)۔ اب جیسا کہ بدامنی جاری ہے، شامی مظاہرین نہ صرف اسد مخالف نعرے لگا رہے ہیں بلکہ حزب اللہ کے خلاف بھی آوازیں بلند ہورہی ہیں۔ گو کہ یہ محض اندازہ ہے لیکن کئی شامیوں کو یقین ہے کہ حزب اللہ عناصر شام میں تیار ہیں کہ وہ حزب اختلاف کی جانب سے طاقتور چڑھائی کی مزاحمت کریں۔ شام اب خطے میں دہشت گرد گروپوں کو ہدایات جاری نہیں کرتا لیکن اس کے بجائے موجودہ حالات کو برقرار رکھنے کے لیے ان کی سنگ دلی پر بھروسہ کرنے لگا ہے۔

لیکن حیران کن طور پر دہشت گرد گماشتے جن کے وہ عرصے تک حامی و مددگار رہے، ان کی حکومت اور شامی ریاست کو بیرونی رجعت پسند و عسکریت پسند قوتوں (واضح طور پر کہا جائے تو القاعدہ) سے محفوظ رکھنے کے قابل نہیں۔ عراق اور شام کے درمیان ۴۰۰ میل کی سرحد اب اسد حکومت کے خلاف حملوں کے لیے داخلے کا مقام بن چکی ہے۔ قلیل لیکن حکمران اشرافیہ پر مبنی علوی (ایک شیعہ مسلم فرقہ) اور اکثریت میں لیکن نظرانداز کردہ سنی آبادی کے درمیان اب شام فرقہ وارانہ تشدد کا نیا میدان بن چکا ہے۔

امریکہ کی جانب سے شام کے معاملے میں مداخلت کرنے میں ہچکچاہٹ دراصل حافظ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بشارالاسد کی اس دھمکی کی وجہ سے ہے کہ اگر انہیں ہٹایا گیا تو پیدا ہونے والا خلا اخوان المسلمون یا رجعت پسند اسلامی گروہوں کے ریاست پر قبضے کی صورت میں نکلے گا۔ بات درست بھی ہے، شام کی آبادی مختلف فرقوں اور نسلوں پر مشتمل ہے جو رجعت پسند عناصر پر حاوی آنے کے لیے کمزور ہے۔ ''گوکہ یہ جاننا ناممکن ہے کہ عوام کس حد تک اخوان کے ساتھ ہمدردیاں رکھتے ہیں لیکن بڑھتی ہوئی مذہب پسندی اور قابل اعتماد آزاد خیال رجحانات کی کمی اخوان کو اہم سیاسی قوت ضرور بنا دے گی، اگر اسے سیاسی طور پر متحرک ہونے کی اجازت دی گئی تو'' (لینڈس، پیس، ۲۰۰۶ء)۔ مصر کے مقابلے میں جہاں حسنی مبارک کے ہٹائے جانے کے مراحل میں اخوان کنارے کنارے پر رہے، شام میں وہ مختلف گروہوں کے درمیان انتشار پیدا کر کے طاقت حاصل کر سکتے ہیں اور نتیجے میں پڑوسی اسرائیل (جولان کی پہاڑیوں پر)، ترکی، لبنان، اردن اور عراق (خطے میں امریکہ کے تمام کلیدی شراکت داروں) کے لیے مسائل کھڑے کر سکتے ہیں۔ اب جبکہ امریکہ شام کی جانب دیکھتا ہوا مخمصے کا شکار ہے کہ اگر فرقہ وارانہ تشدد سے آنے والے دنوں میں یہ علاقہ نیا عراق بن جائے گا تو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ عراق کے مقابلے میں شام کے طاقتور پڑوسیوں کا تعمیر نو کے لیے بہت کچھ داؤ پر لگا ہوگا۔

آج شام کے مستقبل کے حوالے سے امریکہ اور خطے کے لیے سب سے بڑا خطرہ ایران ہے۔ گوکہ صدام حکومت نے ہمیشہ ایران کی عرب دنیا میں مداخلت کو روکے رکھا، لیکن ان کی بے دخلی کا مطلب ہے کہ اب تمام راستے شام میں کھلے ہیں۔ شام-ایران تعلقات پھلنے پھولنے شروع ہوئے، بڑھتی ہوئی تجارت سے لے کر شام میں پھیلے مقدس مقامات کی زیارت کے لیے زیادہ سے زیادہ افراد کی آمد تک۔ سعودی عرب مشرق وسطیٰ کے لیونت خطے (بنیادی طور پر لبنان، فلسطین اور شام) میں ایران کے اثر ورسوخ کو خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے، اور نتیجے میں ریاست مجبور ہو کر اسد حکومت کے ساتھ تعلقات کو سہارا دے رہی ہے۔ سعودی عرب اور مشرق وسطیٰ کے خلیجی ممالک جدید تاریخ میں کبھی اختلافات کا شکار نہیں ہوئے، لیکن اب ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ ہر کوئی بشارالاسد کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ماضی کی طرح شام کو علاقائی طاقت کی حیثیت سے اوپر لانے میں ترکی کے ساتھ نیا اتحاد اہم ہے۔ ماضی کے دشمن ان ممالک میں سے شام کے لیے ترکی یورپ کا داخلی دروازہ ہے۔ ۱۹۹۸ء میں ترکی نے شام کے خلاف ایک زبردست فوجی حملے کی تیاری تقریباً کر ڈالی تھی جب PKK کے رہنما عبداللہ اوجلان نے شام میں پناہ لی تھی۔ جب لاکھوں ترک فوجی شامی سرحد پر پہنچے تو شام نے فوری اندازہ لگالیا کہ اس کی عسکری صلاحیتیں ترکی سے کہیں کم ہیں۔ اس لیے فوری طور پر اوجلان کو ترکی کے حوالے کیا اور شام-ترکی تعلقات کے اچھے دور کا آغاز ہوا۔

میدان عمل میں امریکہ نے دونوں ممالک کے درمیان نئی شراکت داری کا خیر مقدم کیا۔ ترکی امریکہ کا ایک اتحادی اور نیٹو کا کلیدی رکن ہے اور یہ بتانا ضروری نہیں کہ ایک جمہوری اسلامی ریاست بھی جو مغربی سیاسی و اقتصادی اقدار کو اپنانے کی خواہاں ہے۔ اس کے برخلاف شام کے ترکی جیسی ابھرتی ہوئی معاشی قوت کے ساتھ تعلقات کا مطلب ہے امریکی پابندیوں کا شام پر اثر محدود ہوگا۔ اتفاق سے جو بات شام ترکی تعلقات کو پیچیدہ بناتی ہے، وہ امریکہ کی جانب سے ترکی اور اسرائیل کے درمیان تعلقات کو مضبوط بنانے کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ یہ دمشق کے لیے ایک واضح خطرے کی حیثیت سے دیکھا گیا اور یہ اسرائیل کے ابھرتے ہوئے خطرے سے نمٹنے کے لیے اسد حکومت کو ایرانیوں کی جانب مزید دھکیلتا ہے۔ ''شام اور اس کا اتحادی ایران خود کو اس نئے اتحاد کا براہِ راست ہدف دیکھتے ہیں اور مزید قریبی تعلق میں جڑ گئے ہیں۔'' (سیل، ۲۰۰۰ء)

ایک لمحے کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ واشنگٹن شام کو ویسی ہی توجہ دینے جا رہا ہے جو کسنجر کے عہد میں دی گئی تھی۔ خوش قسمتی سے یہ گمان بہت مختصر تھا جب درعا کے جنوبی قصبے میں نوجوان طلبہ نے اپنے اسکول کی دیواروں پر حکومت مخالف پیغامات لکھے اور پھر حکومت کی جانب سے تشدد کا شکار بنے۔ کئی شامیوں کے لیے ترقی کی دہائی، جس میں کئی صنعتوں کی نجکاری ہوئی، درمیانے طبقے کو پھلنے پھولنے کے مواقع ملے اور شام کو مغرب کی جانب سے قبولیت ملی مختصر اور عارضی ثابت ہوئی۔

آج سعودی عرب، ترکی اور دنیا کے کئی ممالک نے اسد حکومت سے اپنی پیٹھ پھیر لی ہے۔ حتیٰ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ روس نے بھی بشار الاسد پر دباؤ ڈالا ہے کہ وہ تشدد کو روکنے کے لیے سخت اقدامات کریں، بصورت دیگر ماسکو خطے میں کسی نئے اتحادی کو ڈھونڈے گا، یہ واضح دھمکی ہے۔ اسد کی حکومت بچے یا ختم ہو جائے، بہر صورت شام کی معیشت کئی دہائیاں پیچھے چلی جائے گی، ملک کی عسکری طاقت کی ہوا نکل جائے گی اور ان کا علاقائی اثر و رسوخ بھی ختم ہو جائے گا۔ امریکہ کی مشرق وسطیٰ خارجہ پالیسی کا یہ کانٹا اب ایک مرجھایا ہوا پتہ بن چکا ہے۔

مصر میں ناقابلِ برداشت بیداری

جب محض ۱۸ دن کے مظاہروں کے بعد حسنی مبارک نے صدر کی حیثیت سے استعفیٰ دینے کا اعلان کیا تو لاکھوں افراد نے اس کا زبردست جشن منایا۔ لیکن حسنی مبارک کے ۳۰ سالہ عہد نے ظاہر کیا کہ عسکری جرنیلوں کے مقابلے میں درحقیقت وہ کم ترین قوت رکھتے تھے۔ بدعنوان حسنی مبارک کے داخلی حلقوں کے سائے تلے عسکری جرنیلوں نے عوام میں عزت و اعتماد حاصل کیا۔ البتہ، ایوان صدر سے اختیارات حاصل کرنے کے لیے میدان تحریر پر شہری نوجوانوں کی جانب سے کچھ مزاحمت کا ضرور سامنا ہوا لیکن یہ نعرے جلد ہی معدوم ہو گئے کیونکہ عوام کو پہلے جمہوری صدارتی انتخابات میں لگا دیا گیا۔ یہ امریکہ کے لیے بہت اہم تھا کیونکہ کئی حلقوں نے سمجھ رکھا تھا کہ حسنی مبارک کے زوال سے امریکہ نے مصر میں ایک قریبی اتحادی کھو دیا ہے۔

درحقیقت حسنی مبارک محض ایک شراکت دار تھے، اور حقیقی اتحاد مصر کے عسکری جرنیلوں اور واشنگٹن ڈی سی کے درمیان تھا۔ ۱۹۷۹ء کے مصر-اسرائیل امن معاہدے کے آغاز سے اب تک دی جانے والی ۳.۱ ارب ڈالرز کی امداد مصری فوج کے لیے تھی، عوام کے لیے نہیں، بلکہ صدر کے لیے تو اس سے بھی کم تھی۔ ''گو کہ مصر کے کل عسکری اخراجات کے بارے میں کوئی قابل تصدیق اعداد و شمار موجود نہیں، لیکن اندازہ ہے کہ وزارت دفاع کے ہتھیار لینے کے اخراجات کا ۸۰ فیصد امریکی عسکری امداد پر مشتمل ہے۔'' (شارپ، ۲۰۱۲ء)

انور سادات کے قتل کے بعد سے آخر تک حسنی مبارک نے امریکہ کے کل ۲۳ دورے کیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(history.state.gov، ۲۰۱۲ء)۔ لیکن بین الاقوامی عسکری تعلیم وتربیت (IMET) امداد برائے مصر کے تحت عسکری جرنیلوں نے ۱۹۷۸ء کے بعد ہر سال امریکہ کے دورے کیے اور تربیت حاصل کی، جو کل ۳۴ دورے بنتے ہیں۔

واشنگٹن نے اضطرابی کیفیت میں ۲۰۱۲ء کے اوائل میں ہونے والے پارلیمانی انتخابات میں اخوان المسلمون کو کثیر تعداد میں نشستیں جیتتے ہوئے دیکھا۔ مصر میں قومی دھارے کو تبدیل ہوتا دیکھ کر عسکری قیادت کی سپریم کونسل برائے مسلح افواج مدد کے لیے آئی، جس نے واشنگٹن کو خطرات پر یقین دہانی کروائی اور تین دہائیوں سے موجود حالت کو برقرار رکھنے کا عہد کیا۔ مسلح افواج کی سپریم کونسل نے آئین میں ترامیم اور تبدیلیوں کے عمل میں مستقل مداخلت کی اور کابینہ کو نامزد کرنے کے اختیار تک کو برقرار رکھا۔ امریکی مفادات بدستور موجود رہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب سپریم کونسل اخوان المسلمون کی قوت کو گھٹانے کی کوشش کر رہی تھی، تو کونسل کے اقدامات نے اخوان کو اپنے وعدے کے برخلاف مجبور کیا کہ وہ اپنا صدارتی امیدوار کھڑا نہ کرے صرف اس لیے کہ صدارتی نشست ملک میں اختیار حاصل کرنے کے لیے ان کا آخری راستہ ہوگا۔ اس لیے کسی کو حیرت نہیں ہوئی کہ عسکری کونسل نے صدارتی نشست کے اختیارات کو محض ایک نمائشی حیثیت تک پہنچا دیا۔

بر ہم مصریوں کی، جنہوں نے حالات کو بدلنے کے لیے میدان تحریر پر دن رات انتھک اور سخت جدوجہد کی تھی، آنکھیں بری طرح کھول دی گئیں۔ حسنی مبارک کی بے رحمی اور بدعنوانی ان جرنیلوں کی مدد سے ممکن ہوئی تھی جو پردے کے پیچھے بے پروا کھڑے تھے۔ یہ انکشاف جس کا لاکھوں افراد اندازہ نہ لگا سکے، ویسا ہی تھی کہ لاکھوں مصریوں نے سمجھنے سے انکار کر دیا کہ اصل طاقت مبارک نہیں تھے۔ میدان تحریر میں موجود افراد اس ناجائز قوت پر روشنی ڈال کر کچھ حاصل کرنے میں تو کامیاب رہے لیکن اب مصری عوام میں اتنی سکت یا خواہش نہیں کہ وہ میدان تحریر میں کندھے سے کندھے ملا کر کھڑے رہیں اور تبدیلی کا مطالبہ کریں جو ان کے خیال میں انہوں نے حاصل کر لی تھی۔ اگر تحریک برقرار رہتی تب بھی اخوان المسلمون کے محمد مرسی (آزادی و انصاف پارٹی) اور احمد شفیق (آزاد پارٹی) کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درمیان انتخابات ایک بہت قریبی و فیصلہ کن دوڑ تھی ، یعنی مصر کے عوام اب متحد نہیں رہے ۔ محمد مرسی کو اب تمام مصری عوام کو یکجا کرنا ہوگا اس لیے نہیں کہ اخلاقی طور پر یہ جمہوری طور پر منتخب ہونے والے صدر کے لیے درست اقدام ہے بلکہ اس لیے کہ سپریم کونسل کے مقابلے میں اختیار حاصل کرنے کا واحد راستہ یہی ہے ۔ اس طرح کرنے میں انتخابات میں پیش کردہ سخت گیر فن خطابت کو لازمی اعتدال میں آنا چاہیے جو مشکل ضرور ہے کیونکہ اخوان کو تقریباً پچاس سالوں تک مصر میں خاموش رکھا گیا ۔ ''فوج اخوان کو دبا رہی ہے ، اور اخوان کے پاس کوئی واضح جواب نہیں ہے ۔'' (مارٹینی ، ۲۰۱۲ء)

حزبِ اختلاف کے خلاف مبارک کی بے رحمی اور بڑے پیمانے پر بدعنوانی کے پیچھے درحقیقت یہ فوج تھی جو ان کی ہر حرکت کی پیمانہ بندی کرتی اور سہارا دیتی تھی اور مبارک صرف ایک نمائشی حیثیت سے مصر کے عوام کے ترقی نہ کرنے اور عوام کو مواقع پیش نہ کر پانے کے ذمہ دار بنے ہوئے تھے ۔ اس کے باوجود اسرائیل کے ساتھ امن برقرار رہا اور امریکہ کے مفادات پھلتے پھولتے رہے ۔

کرنسی کا کھیل

معیشت دان اور عالمی رہنما کسی بھی ملک کی حالت کو جانچنے کے لیے جو کلیدی اشاریے استعمال کرتے ہیں ان میں سے ایک ان کی کرنسی کی قدر ہے ۔ کسی بھی ملک کے لیے کرنسی کا نرخ اس کی طویل المیعاد ترقی کی پیش بینی کرسکتا ہے ، بین الاقوامی مارکیٹ میں قرض تک رسائی ، صارفی اعتماد ، صارفی قیمت اور افراطِ زر ان میں سے صرف چند ہیں ۔

جنوری ۲۰۱۱ء میں عرب بہار کے آغاز سے امریکہ کے اقتصادی دوست ممالک کی کرنسی کی قدر برقرار رہی حالانکہ ہنگامے اور قائدانہ سطح پر تبدیلیاں تک دیکھی گئیں ۔ البتہ ان حکومتوں کی کرنسی کی قدر تیزی سے گری جنہوں نے مشرق وسطیٰ کو متاثر کرتی تبدیلی کی لہر کے خلاف مزاحمت کی ۔ کرنسی کی قدر گرنے کی ظاہری وجہ امریکہ کی جانب سے پابندیاں عائد کرنا اور کئی ممالک کی جانب سے ان کی توثیق کرنا رہا ۔ یہ سمجھنا اہم ہے کہ مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک کے لیے معاشی بہبود کا براہ راست تعلق امریکہ کے ساتھ ان کے تعلقات پر ہے ۔ مثال کے طور پر جب کروز میزائل لیبیا کے بنیادی ڈھانچے کو نشانہ بنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہے تھے یا مصر اپنے سیاحتی شعبے کو رکتا ہوا دیکھ رہا تھا، تب بھی ان کی معیشت اور کرنسیوں کی قدر برقرار رہی اور عرب بہار کی وجہ سے ہونے والے بگاڑ کے مقابلے میں بھی وہ تیزی سے بحال ہوئے۔ یہی حوالہ تیونس حتیٰ کہ یمن کے بارے میں بھی دیا جا سکتا ہے۔ البتہ شام اور ایران جیسے ممالک میں، معمولی یا نہ ہونے کے برابر مداخلت کے باوجود بھی صارفی قیمتوں میں اضافہ ہوا اور ان کی کرنسیاں اپنی قدر ایک چوتھائی تک کھو بیٹھیں، اور خطرہ اُس مڈل کلاس کی برداشت کی آخری حدوں تک پہنچ گیا، جن کی وجہ سے ان کے اقتدار کو دوام حاصل ہے۔ لیبیا، مصر اور سب سے اہم سعودی عرب کے لیے کرنسی کی قدر برقرار رکھنے کی یقینی کیفیت کا نتیجہ ہے کہ امریکہ ان معیشتوں کے ساتھ برآمدات برقرار رکھتا ہے اور امریکی کثیر القومی ادارے موجود رہتے ہیں۔ درحقیقت، مصری بازار حصص، EGX۳۰ ۲۰۱۲ء کے لیے دوسری سب سے بہترین عالمی مارکیٹ رہی اور ۳۰ فیصد اضافے کے ساتھ علاقے کی سب سے بہتر مارکیٹ رہی۔ ذیل میں دیا گیا چارٹ جنوری ۲۰۱۱ء میں عرب بہار کے آغاز پر امریکی ڈالر کے مقابلے میں لیبیا، سعودی عرب، مصر، شام اور ایران کی کرنسیوں کی قدر ظاہر کرتا ہے۔

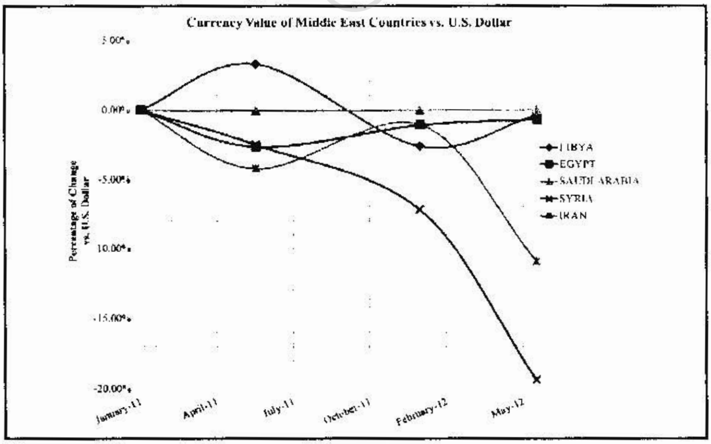

ان اعداد و شمار سے حاصل ہونے والی معلومات کی اہمیت ظاہر کرتی ہے کہ ریاست اضطرابی اور غیر مطمئن کیفیت میں ہو سکتی ہے لیکن اس کی معیشت پر کوئی دباؤ نہیں پڑتا جب تک کہ امریکہ تجارتی شراکت دار ہے۔ یہ ترکی، جنوبی کوریا اور برازیل جیسی علاقائی طاقتوں کے ابھرنے کے باوجود امریکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے پاس موجود اقتصادی سپر طاقت کی تصدیق کرتا ہے۔ اور کوئی بھی چین کو پہچانے بغیر ابھرتی ہوئی معاشی سپر طاقت کا حوالہ نہیں دے سکتا، گو کہ چین کی بے لچک مدد اور نیم صحرائی افریقہ میں اربوں کی سرمایہ کاری بھی افریقی عوام کے لیے ترقی نہ لا سکی۔ یہی بات روس اور ترکی کی شام اور ایران جیسی ریاستوں کے لیے معاشی دروازہ-کھول پالیسی پر لاگو ہو سکتی ہے۔

اکیسویں صدی کی عالمی معیشت نے ثابت کیا کہ دھیمی اور کم قدر کی کرنسیوں کی حامل مارکیٹیں اپنی برآمدات کو پرکشش بنانے کے لیے بدستور جدوجہد کریں گی۔ لیکن جب آپ کی تجارتی مارکیٹ کا ۷۵.۴ فیصد آپ کے ملک سے برآمدات پر پابندی رکھتا ہو، شامی کرنسی کا ہوا میں اڑ جانا ایک چیلنج بن جاتا ہے (الجزیرہ، ۲۰۱۲ء)۔ اسد حکومت کو عرب بہار کے دوران برقرار رکھنے والا دراصل وہ خوشحال درمیانہ طبقہ ہے جو دمشق اور حلب میں مقیم ہے۔ آخر میں جب شام کے قانونی تاجروں کو پابندیوں کی وجہ سے بلیک مارکیٹ کے اسمگلروں سے مسابقت کرنا پڑی تو اقتصادی تباہی کی وجہ سے حکومت کو قبول کرنے کے رجحان میں میں تبدیلی آئی جو یقینی دکھائی دی۔'' بالآخر، اسد کے قریبی افراد پر مشتمل ایک جعلی معیشت بچ گئی ہے۔ کیا ان کا خاتمہ ہو جائے گا، تو اس کے ساتھ پورا معاشی نظام بھی جائے گا'' (بائمین، ۲۰۱۲ء)

حرفِ آخر

لندن اسکول آف اکنامکس سے فواز جرجس (Fawaz Gerges) نے حال ہی میں ایک کتاب ''اوباما اور مشرق وسطیٰ'' تالیف کی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے عرب بہار کو قابو میں رکھنے کا جائزہ لیا اور کہتے ہیں کہ ''انہیں ایک غیر یقینی مستقبل کا سامنا ہے۔ عرب استبدادیت جو مستحکم تھی اور نصف صدی سے امریکی مفادات کو تحفظ دے رہی تھی، کے عدم استحکام کی شروعات ہو چکی ہے۔ نہ ہی امریکی طاقت اور اثر و رسوخ زیادہ مضبوط و پائیدار رہا جیسا کہ وہ ہوتا تھا۔ انقلابی سماجی تبدیلی کی ایک طاقتور لہر یکساں طور پر امریکہ کے دوستوں اور دشمنوں کی بنیادوں کو کاٹ رہی ہے۔ گو کہ نئے مشرقِ وسطیٰ کا خاصہ اب بھی نامعلوم ہے، لیکن ایک چیز یقینی ہے، یہ کبھی بھی ایسا نہیں رہے گا۔''

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(جرجس، ۲۰۱۲ء)۔ جرجس نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا کہ بیس سال پہلے کے مشرق وسطیٰ کے منظرنامے میں فلسطین میں ایک جنگجو پی ایل او شامل تھی، شام اسرائیل کے ساتھ ہر امن معاہدے کو سبوتاژ کرنے کے لیے پرعزم تھا، الجزائر خانہ جنگی میں، عراق کویت کے دروازوں پر، اور ایران تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کہ آج ہے۔ دوسری جانب آج سعودی عرب جی ۲۰ اور ڈبلیو ٹی او کا رکن ہے، شام مفلوج ہے، فلسطین میں الفتح اسرائیل کے ساتھ کام کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور عراق اور لیبیا میں تاریخ کے مقابلے میں پہلے سے کہیں زیادہ امریکی کثیر القومی ادارے ہیں۔ عرب عوام نے القاعدہ کو برداشت نہیں کیا اور اپنی ہی حکومتوں کے خلاف مایوس ہو کر آواز بلند کی، مغرب کے خلاف نہیں۔

''لیکن اس نے عوام کی خواہش کی عکاس حکومتوں سے میری وابستگی کو کم نہیں کیا۔ ہر قوم اس مقصد کے لیے اپنے طریقوں سے جان دیتی ہے، جس کی جڑیں اپنے لوگوں کی روایات میں ہیں۔ امریکہ یہ گمان نہیں کرتا کہ سب کے لیے بہتر کیا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے کہ ہم ایک پرامن انتخاب کے نتیجے کا قیاس نہیں کر پائے۔ لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ تمام لوگ متعدد چیزوں کی خواہش رکھتے ہیں: اپنے ذہن سے بولنے کی صلاحیت اور خود پر کیسی حکومت چاہیے، اس پر بولنے کی طاقت؛ قانون کی حکمرانی پر اعتماد اور انصاف کی یکساں فراہمی؛ حکومت جو شفاف ہو اور لوگوں کو نہ لوٹے؛ اپنی پسند کی زندگی گزارنے کی آزادی۔ یہ صرف امریکی خیالات نہیں، یہ انسانی حقوق ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ میں ہر جگہ ان کی حمایت کروں گا۔ اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے کوئی خط مستقیم نہیں ہے۔ لیکن یہ واضح ہے کہ: ان حقوق کو تحفظ دینے والی حکومتیں بالآخر مستحکم، کامیاب اور محفوظ ہوتی ہیں۔ خیالات کو دبانا کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ امریکہ تمام پرامن اور قانون پسند آوازوں کے حق کا احترام کرتا ہے کہ انہیں دنیا بھر میں سنا جائے، اس صورت میں بھی کہ ہم ان سے اتفاق نہ رکھتے ہوں۔ اور ہم تمام منتخب و پرامن حکومتوں کا خیر مقدم کریں گے بشرطیکہ وہ تمام افراد کا احترام کرتے ہوئے حکومت کریں''

(whitehouse.gov، ۲۰۰۹ء)۔ جرجس اور دیگر ناقدین چیں بہ چیں ہو سکتے ہیں کہ کس طرح اوباما نے ان ضابطوں کو ترک کر دیا۔ لیکن امریکہ نے مبارک پر استعفے کے لیے دباؤ ڈالا اور قذافی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے حامیوں کی جانب سے لیبیا کے مشرقی صوبے کو قتل عام سے محفوظ رکھا۔ شام کے معاملے میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں ووٹ دینے کے ریکارڈ کو مدنظر رکھتے ہوئے روس اور چین کو دعوت مبارزت دی اور ایران کو آبنائے ہرمز میں ایک تہائی عالمی توانائی رسد کا راستہ روکنے سے بچائے رکھا۔ امریکی کوشش بے نقص نہیں تھی، لیکن دیگر عالمی رہنماؤں اور ان کی خارجہ پالیسیوں (روس کی جانب سے شامی حکومت کی حمایت اور چین کی جانب سے سوڈان کی تائید) کے مقابے امریکہ ایک بہتر مثال ہے۔

عرب بہار مشرق وسطیٰ کی تاریخ میں ایک نیا موڑ ثابت ہوئی ہے بالکل سلطنت عثمانیہ کے سقوط، ریاست اسرائیل کی تخلیق، یا سعودی عرب کے شاہ فہد کی جانب سے تیل کی دریافت کی طرح۔ مشرق وسطیٰ ان گنت اہم مواقع کا شاہد ہے جو خطے کے منظرنامے کو ہمیشہ تبدیل کرتے آرہے ہیں۔

ایک خاصیت جسے تمام عرب متفقہ طور پر اپنی شناخت سمجھتے ہیں وہ بہت زیادہ قوم پرست ہونا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ یہی خصوصیت ہے، جس نے سماجی ساخت کو منتشر کیے رکھا ہے اور اس میں چھید کر دیے ہیں۔ یہی وہ موقع ہے جسے امریکہ نے سمجھا کہ اس سے خطے میں اپنے کردار کو برقرار رکھنے کے لیے کلیدی سمجھا جائے۔ سعودیوں کی ایرانیوں سے ناراضگی اور قطریوں سے ہچکچاہٹ، مغربی لیبیا کے قبائل کے مشرقی قبائل کے ساتھ جھگڑے، مصر میں اقلیتی گروہوں کو اخوان کے عروج سے خطرہ اور شام کی سنی مڈل کلاس کے بنیاد پرست عناصر کو ملک پر غلبہ پاتے ہوئے اور موجودہ حالات کو غیر یقینی بنتے ہوئے دیکھنا۔ اور جبکہ دنیا کو توانائی کی طلب اور عالمی امن کو برقرار رکھنے کے لیے پرامن مشرق وسطیٰ کی ضرورت ہے تو انتشار زدہ خطہ کو اپنے حواس کو برقرار رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ بیرونی عناصر پر اعتماد کرنا پڑ رہا ہے۔

چین اور دیگر درمیانی قوتوں کے عروج سے جنم لینے والا مکتب فکر کہ عالمی مسائل اب حل نہیں ہو رہے، بحران سنبھل نہیں رہے، یا عالمی قواعد وضع نہیں ہو رہے، نفاذ تو در کنار، چند مغربی قوتوں کے زیر استعمال رہنے والے پرانے طریقے غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ روس خطے میں اپنے آخری حقیقی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اتحادی پر قابو پانے کی جدوجہد کر رہا ہے، چین اپنے ہاتھ صاف رکھنا چاہتا ہے اور اپنی اویغور آبادی کو مشتعل نہیں کرنا چاہتا ہے، اور ترکی اپنی سرحدوں پر موجود ہزاروں مہاجرین کے ساتھ دیوار سے لگ گیا ہے۔ پھر جیسے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں عثمانی سلطنت کے خاتمے کے بعد ترقی یافتہ دنیا کی مدد کے لیے امریکہ آیا، تو یہی بات اکیسویں صدی کے آغاز میں بھی سچ ہوگی کیونکہ آنے والی دہائیوں میں مشرق وسطیٰ کا مستقبل کیا ہوگا دنیا کھڑی رہے گی اور تماشا دیکھے گی۔

[محمود شیخ علی، ڈپلومیسی ڈیپارٹمنٹ، ناروچ یونیورسٹی امریکہ سے وابستہ ہیں۔]

(ترجمہ: فہد کیہر)

Source: Mahmoud Chikh Ali, "Thank you Arab Spring, Why the United States gets the Last Laugh", *Global Security Studies*, Fall 2012, Vol. 3, Issue 4.

© rasailojaraid.com